غالب :فکر و فرہنگ اور نقدِ تحسین

ڈاکٹر طارق ہاشمی[1]، ڈاکٹر فرحت جبیں وورک ، ڈاکٹر سمیرا اکبر***

Abstract:

"Mirza Ghalib is a classic figure of Persian and Urdu poetry. His poetic importance is due to his rich philosophical thoughts as well as unique style of writing. There is a venerable & well-cherished tradition of Ghalib Studies in Urdu criticism and many important critics have richly contributed to it. Dr Tehseen Firaqi is one those critics who has discussed poetry and prose of Ghalib from an unusual & interesting angle. He has focused on the Persian poetry of Ghalib and has written various articles. Dr Tehseen Firaqi has proved logically that Ghalib doesn't have secular tendencies in his writings but has a strong affiliation with religion."

Key Words: Ghalib, Ideology, Persian, Religion, Secularism, Poetical tradition

کلیدی الفاظ: غالب ، فکر ، فارسی ، مذہب ، لادینیت ، شعری روایت ۔

اُردو شعر و ادب کی آبیاری میں کئی ایک تخلیقی شخصیات نے اپنا تہذیبی کردار ادا کیا ہے اور بلاشبہ ہر کردار اپنی نوع اور کیفیت کے لحاظ سے اہم ہے لیکن میر و غالب اور اقبال ایسی ہستیوں نے تین صدیوں کو محیط اردو شعرو ادب کی جس طرح فکری و اسلوبی نمائندگی کی ہے وہ کسی اور کے تخلیقی ورثے کا حصہ نہیں بن پائی۔ میر کے بعد اردو شعرو ادب سماجی سطح پر مغرب و مشرق کی جس تہذیبی کشمکش کا شکار ہوا اس کا عکس غالب کے ہاں ابتدائی اور ایمائی ہے جبکہ اقبال کی تخلیقات میں اس کی تمثالیں ذرا واضح ہیں۔غالب ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کے نقطہ آغاز پر کھڑے ہیں جبکہ اقبال اُس کے نقطہ انجام پر۔ دونوں اہلِ قلم نے تہذیبی کشمکش کے دورِ پُرہنگام میں اپنا اپنا ثقافتی کردار ادا کیا۔

غالب اور اقبال پر اردو تنقید میں سب سے زیادہ لکھا گیاہے اور لکھا جا رہا ہے۔جو لکھا گیا ہو اس پر معیار کا سوال بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن کئی ایک فکری و فنی موضوعات جن کو سمیٹا گیا ہو ان میں تفہیم و استفہام کے پہلو بھی موجود ہیں۔

مذکورہ دونوں تخلیق کاروں پر تنقید کا ایک اہم نام ڈاکٹر تحسین فراقی کا ہے جو غالب واقبال کو اردو شاعری کا امام قرار دیتے ہیں۔غالب میں اُن کے خیالات کا ذکر بالتفصیل آگے کیا جائے گا لیکن ان کو اجمال میں دیکھنا ہو تو درج ذیل جملے کافی ہیں:

> ''غالب ہمارے لیے محض ایک شاعر نہیں بلکہ ایک تہذیب اور ایک تاریخ ہیں۔ ایسے شاعر، جن کے کلام میں ہند ایرانی تہذیب کے بہترین عناصر جلوہ افروز ہیں، ایک ایسے شاعر جو نفس انسانی کی رنگارنگ اور گہرے تنوعات کی دھنک مرتب کرتے ہیں، وہ روحِ انسانی کے سچے نباض ہیں اور بیکرانی کے پس منظر میں بڑے بڑے سوال اٹھاتے ہیں۔''(۱)

کسی بھی موضوع پر لکھتے ہوئے اُس کے جامع پس منظر کی تفہیم ضروری ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی تنقید کا جائزہ لیا جائے تو اُردو شاعری کے ائمہ اعظم پر حرفِ نقد

---

[1]ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد
** صدر شعبہ اردو، فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی، راولپنڈی
***اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

رقم کرتے ہوئے اُن کا یہ سلیقہ واضح نظر آتا ہے۔ اگرچہ اقبال پر تنقید کا جائزہ انھوں نے بہت مفصل اور متنوع جہتوں سے لیا ہے اور غالب پر تنقیدی تناظر کو ایسی وسعت کے ساتھ نہیں دیکھا لیکن اپنے اختصار میں جامعیت کو ضرور مدنظر رکھا ہے۔

غالب شناسی کے سلسلے میں اُن کی دو کاوشیں لائق ذکر ہیں۔ ایک ''اُردو تنقید کے دس سال'' کے عنوان سے مضمون کا وہ جزو جو غالب پر لکھی گئی کتب سے متعلق ہے اور دوسرا مضمون ''پاکستان میں غالب شناسی__اجمالی جائزہ اور تجاویز'' کے زیرِ عنوان رقم کیا گیا ہے۔

اُردو میں غالب شناسی کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر معلوم کیا جائے تو ایک خاص پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ڈاکٹر تحسین فراقی خود غالب کو کس طرح دریافت کرنا چاہتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ غالب شناسوں کے ہاں کیا تشنگی محسوس کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے غالب شناسوں نے غالب کی اُردو تصانیف پر تو قلم اٹھایا ہے اور بعض صورتوں میں تحقیق و تجزیہ کا حق بھی ادا کیا ہے مگر غالب کی فارسی نظم و نثر کے اس ذخیرے سے بہت کم اعتنا کیا ہے جو مقدار میں ان کے اُردو سرمایے سے کہیں زیادہ ہے اور معیار میں اس سے کسی صورت کم نہیں بلکہ بعض جہتوں سے بمراتب آگے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کیا غزل، کیا قصیدہ اور کیا مثنوی، غالب نے ان اصناف میں اپنی قابلِ رشک انفرادیت کا علم بلند کیا ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ چونکہ فارسی زبان و ادب سے ہمارا رشتہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہونے کو آیا، کٹ چکا ہے ، ہمارے ہاتھ سے وہ کلید گم ہو گئی ہے جو فارسی ادبیات کے سلسلہ در سلسلہ پھیلے رفیع الشان محلات تک ہماری باریابی کا ذریعہ ہو سکتی تھی۔''(۲)

اُردو میں غالب شناسی کے عمل کے بارے میں مذکورہ ارشاد کی روشنی میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے رجحاناتِ نقد کو دیکھا جائے تو آپ نے اپنی زیادہ تر توجہ غالب کی فارسی تخلیقات پر صرف کرتے ہوئے اُردو تنقید کے اُس معروف بیانیے کے ردّ کی کوشش کی ہے جس کے مطابق غالب ایک مذہب بیزار اور دین گریز فرد تھے۔

غالب کی فکر و فرہنگ پر ڈاکٹر تحسین فراقی کے خیالات کے مفصل کے تجزیے سے قبل ایک اجمالی نظر ان کے دومضامین پر ''اردو تنقید کے دس سال'' اور ''پاکستان میں غالب شناسی'' پر ڈال لینی چاہیے۔ اول الذکر مضمون بہت مفصل ہے تاہم اس کا ایک حصہ غالب سے متعلق بعض تصانیف کے تجزیے پر مشتمل ہے جو درج ذیل ہیں:

i۔ غالب کی تہذیبی شخصیت (جیلانی کامران)
ii۔ غالب کون؟ (سلیم احمد)
iii۔ نذرِ غالب (ڈاکٹر وحید قریشی)
iv۔ غالب __شاعر امروز و فردا (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)
v۔غالب اور انقلابِ ستاون (سیّدمعین الرحمن)
vi۔ غالب__شخص اور شاعر (مجنوں گورکھپوری)

مذکورہ کتب کے تجزیات ایک مضمون کا جزو ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ تفصیل سے رقم کیے جانے ممکن نہ تھے اور نہ ہی ان کتب کے مندرجات کو اُس غائر نگہ سے دیکھا گیا ہے جو ڈاکٹر تحسین فراقی کا امتیازِ نقد ہے۔ ان تجزیات میں اُس مرکزی نکتے پر بات کی گئی ہے جو منشائے مصنف ہے یا ایسے قابلِ لحاظ پہلو جن سے بحث کا کوئی دروازہ کھلتا ہو۔

جیلانی کامران نے غالب کو مومن و ذوق کا ہم عصر قرار دینے کے بجائے علاقائی زبانوں کے شعرا کا معاصر قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی یہ سوال اُٹھاتے ہیں:

> ''جیلانی صاحب کے نزدیک فکری اعتبار سے غالب کے ہم عصر، مومن اور ذوق نہیں بلکہ وہ شاعر ہیں جو اس زمانے میں علاقائی زبانوں کے ذریعے اپنی واردات بیان کر رہے تھے، مومن کی مثنویٔ جہاد تو خیر ایک طرف، خود ذوق کے یہاں کلاسیکی علوم اور اُن کی روح (خصوصاً قصائد میں) جس اعتبار سے جلوہ گر ہوئی ہے کیا وہ غالب کو ذوق کی ہم عصریت عطا نہیں

کرتی۔‘‘(۳)

سلیم احمد کی کتاب ’’غالب کون‘‘ نفسیاتی زاویے سے بہت اہم کاوش ہے لیکن اس کے مباحث اپنے باطن میں بہت پیچیدگی رکھتے ہیں۔ اس کتاب کے جائزے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے کسی گہرائی میں جانا مناسب خیال نہیں کیا اور محض ایک پیراگراف ہی رقم کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب ’’نذرِ غالب‘‘ میں اُن کی توجہ کا مرکز دو مضامین ’’غالب اور اس کا ماحول‘‘ اور ’’غالب کا نظریہ شعر‘‘ بنے ہیں۔ ان مضامین کی پسندیدگی کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں غالب کو ایسے ہندی اور فارسی شعرا کے افکار و اثرات کے تناظر میں دیکھا گیا ہے جن کی شاعری میں روحانی ارتقا اور حیرت کی فراوانی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالب پر نفسیاتی حوالے سے بھی گفتگو کی ہے اور غالب کے مقطعوں پر بھی بات کی ہے۔ اس کے علاوہ غالب کا اسلوبِ طنز بھی اُن کا موضوع بنا ہے۔ موخر الذکر مضمون کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ ’’ظرافت اور طنز دونوں کا مقصد اصلاحی ہے۔ ایک کا طریق کار خوش مزاج طبیب کا ہے اور دوسرے کا نشتر بدست جراح کا۔ دونوں کا مقصد صحت فکری و روحانی ہے۔‘‘

’’غالب اور انقلابِ ستاون‘‘ میں شامل مضمون ’’انقلابِ ستاون اور غالب کا شعری رویہ‘‘ میں طرزِ تحقیق کو ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس اعتبار سے سراہاہے کہ اس میں جنگ آزادی سے منسوب غالب کے بیسیوں اشعار کا اصل زمانی زاویہ دکھایا گیا ہے اور حقائق کو واضح کیا گیا ہے۔

ترقی پسند نقاد مجنوں گورکھپوری کی کتاب ’’غالب __ شخص اور شاعر‘‘ پر تنقید میں تجزیہ قدرے کم اور طنز کا رنگ زیادہ ہے۔ انھوں نے ابتدا ہی اس جملے سے کی ہے کہ

> ’’کسی نقاد نے مجنوں صاحب کی تنقید کے بارے میں کہا تھا کہ وہ اتنی دھان پان ہوتی ہے کہ پھونک مارے اڑ جاتی ہے یقین نہ آئے تو ان کی تازہ ترین کتاب ’’غالب __ شخص اور شاعر‘‘ملاحظہ کر لیجیے۔‘‘(۴)

’’پاکستان میں غالب شناسی‘‘ ایک اجمالی نوعیت کا مضمون ہے جس میں کتب و مضامین کی نہ تو کوئی تفصیل مہیا کی گئی، نہ ہی اُن کے عمیق جائزے لیے گئے ہیں۔ ۱۸۲۱ء میں غالب پر لکھی گئی پہلی تحریر بعنوان ’’اسد اللہ اسد‘‘ (اعظم الدولہ) اور پہلی باقاعدہ تصنیف یادگارِ غالب (الطاف حسین حالی) سے لے کر تاحال ہندو پاک میں تصنیف کی جانے والی بعض کتب اور کچھ اہم مقالات کا ذکر نیز اجمالی تجزیہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایک خاص المیے کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے ایک اہم تہذیبی سوال رقم کیا ہے جو معاصر تنقید میں فارسی ناشناسی کے سلسلے میں ان کے ہاں بار بار جنم لیتا ہے۔ وہ غالب شناسی کی ماضی کی روایت کے تو مداح ہیں اور بعض معاصر اہلِ نظر کے حوالے سے بھی اطمینان بخش احساسات کا اظہار کرتے ہیں لیکن ہندو پاک میں فارسی زبان کے زوال کی روشنی میں یہ حرفِ افسوس و استفہام رقم کرتے ہیں:

> ’’موجودہ غالب دوستوں میں کتنے ہیں جو فارسی زبان و ادب سے واقف اور اس کی باریک نزاکتوں سے آگاہ ہیں۔ حالی نے ’’یادگارِ غالب‘‘ میں آج سے ایک سو پندرہ برس پہلے فارسی سے عام اجنبیت کی جس صورتِ حال کا ذکر کیا تھا ، وہ آج ایک خوف ناک المیے کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اگر ملک میں انگریزی زبان کی استعماری بالادستی کا یہی عالم رہا تو ہم غالب جیسے بے مثل شاعر کے حکیمانہ کلام سے استفادہ کرنے اور اسے انیس تنہائی بنانے سے قاصر رہ جائیں گے۔‘‘(۵)

اس مضمون کا اختتام اس تجویز پر کیا گیا ہے کہ غالب کے کلام، اُن کے افکار نیز اسالیب کی درست تفہیم کے لیے فارسی کا چلن عام کیا جائے۔ یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے شاعری کے اس امامِ اعظم کو کلی حیثیت میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اپنی اس تجویز کی روشنی میں وہ اہلِ علم و ادب کے سامنے یہ سوال بھی رکھتے ہیں کہ موجودہ تہذیبی منظرنامہ کیا اس قابل ہے کہ فکر غالب کا کماحقہ

ادراک کر سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

''عام آدمیوں کی اس صدی میں جب The Cult of Ordinary Chap کا ہر چہار جانب شور مچا ہوا ہو، کچھ لوگ ___گلشن ناآفریدہ کے عنادل ___ضرور موجود رہنے چاہئیں جو ہمیں عشق و آگہی اور فکرو فرہنگ کے معانی سمجھا سکیں۔ غالب بالیدہ شعور کے حامل ایک ایسے ہی مرد آگاہ تھے۔ کیا ہمارا موجودہ تہذیبی منظر نامہ غالب کے نادر اور بالیدہ افکار کا متحمل ہو سکتا ہے؟ یہ آج کے تناظر کا ایک اہم سوال ہے۔''(۶)

یہی وہ تہذیبی سوال ہے جو ڈاکٹر تحسین فراقی کی غالب شناسی کی بنیاد ہے۔ انھوں نے غالب کی فکر و فرہنگ کے تعین کے سلسلے میں جو تنقیدی کاوشیں کی ہیں اُن میں سے بیشتر بلکہ تقریباً کل کا تعلق فارسی نظم و نثر سے ہے۔

غالب کے فارسی متون کا مطالعہ تہذیبی، ثقافتی اور روحانی حوالوں سے کیا گیاہے۔ ان مضامین میں تحقیق کی بنیاد بھی انھی عناصر کو بتایا گیاہے اور تحقیق کے گنت کاری انداز سے گریز کیاگیا ہے۔ڈاکٹر تحسین فراقی کے نزدیک ''استخواں شماری'' کا یہ کام ''غالب کا علمی سرمایہ'' کھنگالنے والے ممتاز غالب شناسوں ہی کو زیبا ہے۔

فارسی مکاتیب غالب کا مطالعہ کرتے ہوئے حیات و واقعات کے ساتھ ساتھ غالب کی شخصیت کی بعض صفات پر بات کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ غالب کا احساسِ نسب اعلیٰ ان خطوط میں کس طرح جلوہ گر ہو رہا ہے۔ یہ خطوط تخلیقی سفر کے بارے میں غالب کے بعض تصورات و افکار کے بھی آئینہ دار ہیں۔ اور اپنے عہد کی بعض شخصیات کے عکاس بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان صفحات میں سفر کلکتہ سے وابستہ بعض واقعات اور آگرہ کی یادوں کو بھی رقم کیا گیا ہے لیکن سب سے دلچسپ چیز غالب کے خورونوش و پیراہن کے ذوق سے متعلق اظہارات ہیں۔ مکاتیب غالب کے اسلوب پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر تحسین فراقی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

''مراسلے کو مکالمہ بنانے کا جو دعویٰ غالب اُردو مکاتیب میں کرتے ہیں اس کی اولیں نمود مع اعلان اُن کے فارسی مکاتیب ہی میں ہوئی ہے اور مراسلے کو مکالمہ بنانے کا فن درحقیقت اُن کے ذوقِ حضور کے وفور کا نتیجہ ہے۔''(۷)

مکاتیب غالب کو عصری تناظر میں دیکھتے ہوئے ڈاکٹر تحسین فراقی نے ''پنج آہنگ'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے اور غالب کے عصر کو اپنے زمانے سے جوڑ کر دیکھا ہے۔ بالکل ویسے جیسے ناصر نے اپنے عہد کی رات کو میر کے عہد کی رات سے ملایا تھا۔ غالب کہتے ہیں:

''اب صورت یہ ہے کہ سفلوں اور کم ظرفوں کی بن آئی ہے۔ داد گاہ کا حال داد خواہوں سے زیادہ تباہ کن اور ان کے دل چشم بے وفایاں سے سیاہ تر ہیں۔ جب سے یہاں آیا ہوں، دن رات یہی کچھ دیکھ رہا ہوں۔ نہ کسی میں مروت ہے، نہ خلوص، حاکم خودبین و خود پسند۔ ہر طرف زوال کے آثار ہیں۔ ایک عالم اس تباہی سے نالاں ہے لیکن اس کے اسباب پر کسی کی نظر نہیں۔''(۸)

مذکورہ مضمون میں ''پنج آہنگ'' کے جائزے کے لیے اُن کے پیش نظر محمد عمر صاحب کا اُردو ترجمہ ہے اور اُس سے اقتباسات درج کیے گئے ہیں۔ تاہم اس کے ترجمے کا تجزیہ نہیں کیا گیا۔

مثنوی ''بیانِ نموداری شانِ نبوت وولایت کہ از حقیقت پر تو نورالانوار حضرتِ الوہیت است'' کے بارے میں مولانا حالی نے ''یادگارِ غالب'' میں یہ بتایا ہے کہ غالب کی یہ تخلیق مولانا فضل حق خیر آبادی کی فرمائش پر رقم کی گئی اور یہ شاہ اسمٰعیل شہید کی تصنیف ''تقویۃ الایمان'' کے بعض مندرجات کا منظوم جواب ہے۔

شاہ اسمٰعیل نے اپنی تصنیف میں ''اشراک فی التصریف'' کے باب میں لکھا تھا کہ اللہ ایک حکمِ کن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی، جن اور فرشتہ، جبریل اور محمد□ کے برابر پیدا کر ڈالے۔ اس کے جواب میں غالب نے کہا کہ یہ ازراہِ عجز نہیں، ازراہِ اختیار ہے۔ نبی اکرم بے مثال ہیں۔ خدا اپنے محبوب کے ساتھ سایہ بھی پسند نہیں کرتا تو اُن جیسا اور تخلیق کرنا کیوں گوارا کرے گا۔

منفرد اندر کمالِ ذاتی است

لاجرم مثلش محالِ ذاتی است

نبی کریم کے بارے میں اس نوعیت کے افکار و خیالات عجمی تہذیب میں اپنی بھرپور جدلیاتی صورت میں موجود ہیں۔ ہماری مذہبی دانش رسول اکرم کی ہستی اور صفات کے بارے میں جس مبارزت کی صورتِ حال میں گھری ہوئی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کا یہ مضمون غالب کی مثنوی کے تناظر میں شاہ اسمٰعیل کے افکار نیز اسلوبِ اظہار کی تفہیم کی ایک کوشش ہے اور اس سلسلے میں ان کا نتیجۂ بحث یہ ہے کہ:

''شاہ صاحب کے مزاج اور تحریر میں ضرورت سے زیادہ شدت نہ ہوتی تو اُن کے موقف کو معروضی انداز میں سمجھنے کی کوشش ظہور میں آتیں۔ بہرحال المیہ یہ ہے کہ بدعات و توہمات کا یہ کھیل برعظیم پاک و ہند میں آج بھی اسی شدت اور نت نئی صورتوں میں جاری ہے اب سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری''(۹)

یہ حقیقت ہے کہ مردِ مومن ہندی آج بھی مولوی شاہ اسمٰعیل اور ''پیر'' فضل حق کے مابین مبارزتِ بشر و نور کا کشتہ ہے اور نامعلوم کب تک رہے گا۔

غالب کے فارسی تخلیقی اثاثے میں مثنوی ''چراغِ دیر''ایک سو آٹھ اشعار پر مشتمل ہے اور اس کی بحر ہزج مسدس محذوف ہے۔ اس مثنوی میں غالب نے شہر بنارس کے حسن کی منظر کشی کرتے ہوئے جمالِ شہر کے ساتھ اہلِ جمالِ شہر کا ذکر نہایت سرشاری کے ساتھ کیا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس مثنوی کا جائزہ اس کے اسلوب شعر کے تناظر میں کیا ہے اور اس کے عروضی مطالعے کے ساتھ ساتھ محاکات اور تراکیب کے وصف پر بات کرتے ہوئے اس کا تقابل غنیمت کنجاہی کی مثنوی ''نیرنگ عشق'' جس کا سن تصنیف ۱۶۸۵ء یعنی ''چراغِ دیر'' سے ڈیڑھ سو برس قبل ہے، سے کیا ہے۔ لیکن اس تقابل کو محض مثنویات تک محدود نہیں رکھا بلکہ غالب کے اُردو کلام سے بھی بعض اہم تراکیب کو اس جائزے میں شامل کیا ہے۔ مثلاً:

دلِ ہرذرّہ در جوشِ اناالشرق (غنیمت)
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انالبحر (غالب)

ڈاکٹر تحسین فراقی نے دونوں مثنویوں کے بعض اشعار کو آمنے سامنے رکھ کر تقابل کیا ہے۔ چند امثال ملاحظہ ہوں:

غالب	غنیمت
ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار	ادائے او ہزاراں جلوہ بردوش
خرامے صد قیامت فتنہ دربار	نگاہِ او رمِ آہو در آغوش
ز انگیز قد ، اندازِ خرامے	ز انگیزِ بدن پرگشتہ یکسر
بپائے گلبنے ، گسترده دامے	زِ ہر عضوش عیاں رخسار دیگر
ز رنگیں جلوہ ہا غارت گرِ ہوش	زِ حسنِ دلبرانِ غارتِ ہوش
بہارِ بستر و نوروزِ	تماشا داشت صد کنعاں

آغوش در آغوش

مذکورہ امثال اور ''چراغِ دیر'' کے تجزیے سے یہ امر قطعی طور پر واضح نظر آتا ہے کہ غالب اس مثنوی میں جابہ جا ''نیرنگ عشق'' سے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں لیکن کسی بھی جگہ مذکورہ استفادے یا اثر پذیری کا اشارہ تک نہیں کرتے۔

غالب نے بیدلؔ سے متاثر ہونے اور اُس کے رنگ میں کلام کرنے کا اعتراف کیا ہے مگر بعدازاں اُن کے اثر سے آزاد ہوتے گئے جبکہ غنیمت کے شعر کو لائقِ التفات ہی خیال نہ کیا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے مذکورہ حقائق کی روشنی میں ''چراغِ دیر''کے جائزے کے اختتام پر لکھا ہے:

> ''نیرنگ عشق اور چراغِ دیر دونوں فارسی مثنویات میں بے مثال ہیں۔ غالب کی شاعری پر ممتاز فارسی گو اساتذہ کے اثرات کا جائزہ کسی مردِ مبارز طلب کا منتظر ہے۔ غالب شناسی کے حوالے سے ان اثرات کی نشان دہی نہایت درجہ ضروری ہے تاکہ غالب کی حقیقی دین کا صحیح صحیح تعین کیا جا سکے۔''(۱۰)

''چراغِ دیر'' کی طرح غالب کی مثنوی ''ابر گہر بار'' بھی اُن کی ایک باکمال تخلیق ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ موضوعاتی اعتبارسے دونوں فن پاروں میں اختلاف ہے۔ ایک ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل اس طویل مثنوی میں حمد، نعت اور منقبت کے مضامین بہ کثرت ہیں۔

''ابر گہر بار'' کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہوگا۔ یہ پہلی بار ۱۸۶۳ء میں غالب کے کلیات میں شائع ہوئی اور ۱۸۶۴ء میں اکمل المطابع دہلی سے اشاعت پذیر ہوئی۔ لیکن سرسید کی ''آثار الصنادید'' اور بعض دیگر شواہد کی روشنی میں ۱۸۴۶ء کے آس پاس اس کی تخلیق کا عمل شروع ہو چکا تھا اور غالباً بعض حصے مکمل بھی ہو چکے تھے۔ بعض تحقیقات کی روشنی میں یہ نامکمل حالت میں ہے اور غالب اس میں غزواتِ رسول کا جوتذکرہ کرنا چاہتے تھے وہ نہ کر سکے اور دستیاب حصہ تمہیدی اشعار پر مشتمل ہے۔

''ابر گہر بار'' کے بارے میں یہ تحقیقات اس امر کی بھی غماز ہیں کہ یہ غالب کا ایک بڑا شعری منصوبہ تھا جو بہ وجوہ تکمیل پذیر نہ ہو سکا۔

فکری لحاظ سے غالب کی افتادِ طبع کا جوعکس اس تخلیق سے سامنے آتا ہے اُس کی روشنی میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے اسے وہ کلید قرار دیا ہے جس سے غالب کی شخصیت کے بہت سے درواہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''غالب کی تفہیم کے لیے اس مثنوی کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ بلکہ مثنویوں کے ساتھ ساتھ اُن کے فارسی قصائد بھی پیش نظر رہنے چاہئیں۔ اپنے فارسی کلام کی طرف متعدد بار توجہ دلانے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پورا غالب تو اُن کے فارسی کلام کو پڑھ کر ہی سمجھ میں آسکتا ہے۔''(۱۱)

مثنوی ''ابرگہر بار'' یقینا اپنے باطن میں روحانیت کے بے شمار درخشندہ عناصر رکھتی ہے۔ خدا کے حضور عجز و نیاز انبیائے کرام کی تعظیم بہ طورِ خاص رسول اکرم سے محبت اور دعا و مناجات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ غالب پر لکھنے والے بعض اہلِ نقد نے اُن کی شخصیت میں تشکیک و الحاد کے جن پہلوؤں کواجاگر کیا ہے، انھوں نے مطالعۂ غالب کلی اعتبار سے نہیں کیا۔ ذیل میں اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خہے قبلۂ آدمی زادگاں
نظر گاہِ پیشیں فرستادگاں
بلندی دہِ کعبہ بالائے او
گرامی کنِ سجدہ ، سیمائے او
یمن روشن از پر تو روئے او

ختن بستۂ چین گیسوئے او
کہ تا گردشِ چرخِ نیلوفری
بود سبز جایش بہ پیغمبری

ادب ورز ، دیں جو و آئیں گزیں
بہ فنِ سخن شیوۂ دیں گزیں
بہ راہے کنی پویہ کز پائے تو
درخشد چو خورشید سیمائے تو
بہ کارے زدی دست کز سازِ تو
دم جبرئیلؑ است ہمراز تو
ترا بخت در کار یاری دہاد
بہ پیوند دیں استواری دہاد

مذکورہ اشعار کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ غالب کا باطن کس قدر منور تھا اور تیقن کی اِس روشنی نے انھیں گم کردہ راہی نہیں بننے دیا۔ بہ طور ایک تخلیق کار غالب کے شعری مزاج کا جو عکس اس نوعیت کے اشعار میں ظاہر ہو تا ہے، ڈاکٹر تحسین فراقی کا درج ذیل سوال اور دعویٰ اہلِ نظر کے لیے یقینا لائق غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے کہنے دیجیے کہ دینی ادب کا، جس کا ایک نام اسلامی ادب بھی ہے، نعرہ بلند کرنے والا پہلا شاعر غالب تھا۔ خود کو مشورہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ادب اختیار کر! دین کی تلاش کر! آئین اپنا اور فنِ سخن میں شیوۂ دین اختیار کر ! فن سخن میں شیوۂ دین اختیار کرنے کا مفہوم اس کے سوااور کیا ہے کہ ادب کا قبلہ درست کیا جائے اور اسے اس حقیقت سے منسلک کر دیا جائے جو حقیقۃ الحقائق اور نورالانوار ہے۔''(۱۲)

غالب کے دینی میلانات کے تناظر میں مثنوی ''دعائے صباح'' کا مطالعہ بھی کیا جائے تو ایک اور زاویہ سامنے آسکتا ہے۔ ۱۲۰ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی حضرت علیؓ سے منسوب ایک دعا کا ترجمہ ہے اور غالب کی وفات سے دوبرس قبل شائع ہوئی۔

مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کے ہاں دینی میلانات جہاں اُن کی بعض فارسی مثنویات میں ملتے ہیں۔ وہاں شاہانِ تیموری کی تاریخ ''مہرِ نیم روز'' کے مندرجات بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے غالب کی اس تصنیف کا جائزہ اس نقطۂ نظر سے لیتے ہوئے اسے گہرے دینی شعور اور عمررفتہ کی رائیگانی پر تاسف کی دستاویز قرار دیا ہے۔ اپنے جائزے میں انھوں نے سید رحمت علی خان بہادر کی تصنیف ''سراج المعرفت''کے غالب کے تحریر کردہ دیباچے، حالی کی کتاب '' یادگارِ غالب'' اور بعض مکاتیب سے اقتباسات کا بھی برمحل حوالہ دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ غالب پر عبدیت کا احساس کس قدر غالب آگیا تھا۔

ممتاز جرمن مستشرق این مری شمل نے جہاں رومی، اقبال، تصوف اور ہندوستانی تہذیب کے سلسلے میں لائقِ ذکر کام کیا، دلّی سے ۱۹۷۴ء میں شائع ہونے والی اُن کی تصنیف " A Dance of Sparks" غالب کی شاعری میں شرر اور آگ کی تمثالوں کے حوالے سے لائقِ مطالعہ ہے۔ اس کتاب کا مقصد بقول این مری شمل غالب کی تمثال کاری کے ایک پیچیدہ نظام سے مغربی قاری کو متعارف کرا کے اس کو تقابل ادبیات کے میدان تک رسائی دینے کی تمنا ہے۔

این مری شمل اپنی اس آرزو کو برلانے میں بہت حد تک کامیاب ہوئی ہیں اور غالب کی شاعری کے ایک ایسے پہلو کو اجاگر کیا ہے جو عالمی شاعری میں بعض اہم شعرا کے ہاں خاص ہے اور انھوں نے اپنی شاعری میں آگ کی تمثالوں کو اپنے اسلوب کا نمایاں وصف بنایا ہے۔

"A Dance of Sparks" کی اہمیت ڈاکٹر تحسین فراقی کے نزدیک کیا ہے اس سلسلے میں اُن

کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

''شمل نے اپنی کتاب "A Dance of Sparks" (تمثال رقص شرار) میں غالب کی اُردو اور فارسی شاعری سے ایسے اشعار چنے اور ان کا محاکمہ کیا ہے جو شرر، شعلے یا آگ کی تمثالوں کے توسط سے غالب کے باطنی محسوسات کو بیان کرتے ہیں۔ اس باب میں شمل نے بعض مقامات پر قابلِ قدر نکات اٹھائے ہیں۔ تاہم یہ کہنا بے محل نہیں کہ شمل سے پہلے بھی بعض نقادوں نے شعلہ و آتش کی تمثالوں کے حوالے سے بعض فکر افروز باتیں کی ہیں۔''(۱۳)

این مری شمل کی اس کتاب کا جائزہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے دو پہلوؤں سے لیا ہے۔ ایک اس کتاب کے مباحث دوسرا اشعار کے تراجم۔ اوّل الذکر پہلو کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی کے تجزیے کا ماحصل یہ ہے کہ شمل کے مقالے "Ghalib's Qasida in Honour of the Prophet" میں غیر معمولی عقیدت اور عشق کی گہری صداقت نظر آتی ہے۔ غالب کے ہاں آگ کی علامت نو بہ نو پیرایوں میں جلوہ گر ہوتی ہے لیکن شمل نے بعض اہم اشعار سے استشہاد نہیں کیا۔

اُن کے بعض بیانات کی صداقت بھی محل نظر ہے۔ خصوصاً میر عبدالصمد کے بارے میں اُن کا بیان کہ غالب نے اُن سے فارسی زبان کی نزاکتیں سیکھیں۔ دارورسن کی ترکیب ہندو فارس کی شاعری میں بہت پہلے سے مروج تھی جبکہ شمل کے مطابق اسے غالب کے بعدمرکزی موضوع کا درجہ نصیب ہوا۔

این مری شمل کے ترجمے کے سلسلے میں اُن کا تجزیہ ہے کہ اشعار کے ترجمے میں اُن کی کمزوری کئی ایک حوالوں سے ظاہر ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ بعض علامات و تلازمات کے سلسلے میں بھی اُن کا ادراک مستحکم نظر نہیں آتا۔ وہ غالب ایسے بے مثال اور عمیق و دقیق شاعر کے متعدد معانی سے سرسری گزر گئیں۔

بحیثیت مجموعی ڈاکٹر تحسین فراقی نے این مری شمل کے بارے میں بہت متوازن رائے دی ہے۔ لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ این مری شمل نے مغربی قارئین سے غالب کے فکروفن کو متعارف کرانے کے لیے جو متعدد علمی کاوشیں کیں وہ یقینا لائق داد ہیں۔ جگہ جگہ ان کی نکتہ آفرینی قارئین سے خراجِ توصیف بھی وصول کرتی ہے مگر یہ طے ہے کہ تحریر اور تعجیل میں ازل کا بیر ہے۔ اے کاش وہ فارسی ادبیات کی تحصیل زیادہ استقلال اور تسلسل سے کرتیں اور اپنے لکھنے کی رفتار پر روک لگاتیں۔''(۱۴)

غالب کی فکر و فرہنگ کی تفہیم میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے جن پہلوئوں پر قلم اٹھایا ہے ان کا تعلق فارسی کلا م سے ہے اور یہ ایسا گوشہ ہے جس پر معاصر تنقید میں بہت کم لکھا گیا ہے۔اس سے بڑھ کر یہ اور لائق ذکر ہے کہ بعض ایسے تحقیقی نتائج مرتب کیے گئے ہیں جو نہ صرف نئے ہیں بلکہ غالب کی شخصیت اور شاعری کے سلسلے میں بعض معروف بیانیوں کا ایک الگ زاویہ واضح کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے نقطہ نظر سے اختلاف کی صورتیں سامنے آ سکی ہیں ان کا موقف جن دلائل کی بنیاد پر میرے سامنے آیا ہے اس سے رو گردانی ممکن نہیں ۔

حوالہ جات

۱۔ تحسین فراقی،ڈاکٹر، **غالب-فکر و فرہنگ**،نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۱۲ء، ص۱۷۲
۲۔ ایضاً، ص۴
۳۔ تحسین فراقی،ڈاکٹر، **جستجو**، لاہور:القمر انٹرپرائزز، ۹۹۷ ۱،ص۶۵-۶۶
۴۔ ایضاً، ص۶۹-۷۰
۵۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر،**غالب- فکر و فرہنگ**، ص۱۷۰
۶۔ ایضاً، ص۱۷۱
۷۔ ایضاً، ص۵۱
۸۔ ایضاً، ص۵۱
۹۔ ایضاً، ص۶۹-۷۰
۱۰۔ ایضاً، ص۹۰
۱۱۔ ایضاً، ص۱۰۰
۱۲۔ ایضاً، ص۱۰۳
۱۳۔ ایضاً، ص۱۲۷
۱۴۔ ایضاً، ص۱۶۱